R. No. 2186/57 Regd. No. L.922

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

Date
1-8-15-22

Phone—29
Annual Rs. 4/-
per Copy-12

جلد ۱۔ شمارہ ۳	ایڈیٹر: آل احمد سرور	۱۵ر جنوری ۱۹۶۸ء

اداریہ

سہ لسانی فارمولا اور اردو

سہ لسانی فارمولے کا تصور اچھا تھا مگر اب تک اس پر جس طرح عمل ہوا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فارمولے میں بھی لسانی اقلیتوں کے طلبہ خصوصاً اردو کے طلبہ کے لیے دشواریاں موجود ہیں۔ اس فارمولے کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ علاوہ اپنی علاقائی زبان اور انگریزی کے، ایک جدید ہندوستانی زبان بھی پڑھیں۔ مگر ہوا یہ کہ بڑے وزیروں کی کانفرنس نے ۱۹۶۱ء میں اس میں کچھ لچک پیدا کر دی اور جدید ہندوستانی زبانوں کی جگہ دستور کے آٹھویں شیڈول میں درج زبانوں کو تیسری زبان کے طور پر پڑھانے کی گنجائش نکالی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اتر پردیش میں زیادہ تر تیسری زبان کے طور پر سنسکرت کا انتظام کیا گیا، اور وہ طلبہ بھی بہت ہی کم پڑھ سکے جن کی مادری زبان اردو تھی۔ جب تمام ماہرین تعلیم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ پہلی جگہ مادری زبان کی تعلیم کو ملنی چاہیے اور علاقائی یا مرکز کی سرکاری زبان کو دوسری، تو پھر یہ بات اور بھی قابل اعتراض ہو جاتی ہے کہ لسانی اقلیتوں کو اپنی مادری زبان تیسری زبان کے طور پر پڑھنے کا بھی موقع نہ مل سکے۔ اس مسئلے پر کوٹھاری کمیشن نے خاصی توجہ کی ہے اور یہ تسلیم کیا ہے کہ سہ لسانی فارمولا کے نفاذ میں تعلیمی مقاصد سے زیادہ سیاسی مصالح برتے گئے۔ اس لئے اس نے ایک ترمیم شدہ سہ لسانی فارمولا پیش کیا ہے جس کے مطابق دوسری اور تیسری زبانیں ساتھ ساتھ شروع نہ ہوں گی۔ نیا فارمولا یہ ہے:۔

(۱) مادری زبان یا علاقائی زبان

(۲) مرکز کی سرکاری زبان یا مرکز کی دوسری سرکاری زبان جب تک یہ صورت رہے۔

(۳) ایک جدید ہندوستانی یا بیرونی زبان جو (۱) اور (۲) کے ذیل میں نہ آتی ہو اور وہ زبان نہ ہو جو ذریعہ تعلیم کے طور پر استعمال ہوتی ہو۔

کمیشن نے اس فارمولے کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ لوور پرائمری درجے پر صرف ایک زبان پڑھائی جائے۔ جو یا تو طالب علم کی مادری زبان ہو یا علاقائی زبان یعنی انتخاب کا طالب علم کو اختیار ہو۔ عام طور پر مادری زبان علاقائی زبان ہوگی مگر لسانی اقلیتوں کے بچوں کے لیے ان کی مادری زبان لازمی ہو اور ان کے ذریعے سے تعلیم بھی دی جائے۔ ہاں تیسرے درجے سے اگر اختیاری طور پر یہ بچے علاقائی زبان بھی سیکھ لیں تو اچھا ہے مگر اس مسئلے میں کسی طرح کا جبر مناسب نہ ہوگا۔ کمیشن نے صاف کہا ہے کہ لسانی اقلیت کے بچوں کے لیے اس منزل پر علاقائی زبان کی تعلیم لازمی کر دینا کسی طرح مناسب نہ ہوگا اور نہ دوسری زبان کے طور پر انگریزی پڑھانا اس منزل پر کسی طرح مفید ہوگا۔

اعلیٰ پرائمری منزل پر دو زبانیں لازمی طور پر پڑھائی جانی چاہئیں۔ (۱) مادری زبان یا علاقائی زبان اور (۲) مرکز کی سرکاری زبان یا مرکز کی دوسری زبان۔ یہاں اختیاری طور پر ایک تیسری زبان لینے کی بھی سہولت ہونی چاہیے اور سکنڈری منزل (آٹھویں سے دسویں تک) یہاں تین زبانوں کا پڑھنا لازمی ہوگا اور جس طالب علم نے مرکز کی سرکاری زبان یا دوسری سرکاری زبان اس سے پہلے نہیں پڑھی ہے وہ اس منزل پر لازمی طور پر ان میں سے ایک زبان پڑھے گا۔

کمیشن کی سفارش کے تین پہلو اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ مادری زبان کی تعلیم کو مقدم رکھا جائے اور لسانی اقلیتوں کے بچے ابتدائی منزل پر مادری زبان ضرور پڑھیں خواہ وہ علاقائی زبان نہ پڑھیں۔ دوسرا یہ ہے کہ دوسری اور تیسری زبانیں ساتھ ساتھ شروع نہ ہوں۔ تیسری زبان آٹھویں درجے سے شروع کی جائے جبکہ دوسری زبان اعلیٰ پرائمری منزل یعنی پانچویں درجے سے شروع کی جا چکی ہو۔ طلبہ اگر اختیاری طور پر کسی منزل پر کوئی اور زبان پڑھنا چاہیں تو اس کی سہولت ہو مگر کسی قسم کا جبر نہ ہو۔

کمیشن کے سامنے چونکہ تعلیمی مقاصد ہیں اس لیے اس کی تجاویز بہت اہم ہیں اور اصولی طور پر برتنے کے قابل ہیں، مگر عملی دشواریاں یہاں بھی باقی رہتی ہیں۔ جن ریاستوں میں ہندی علاقائی زبان اور سرکاری زبان ہے وہاں لسانی اقلیتوں کے بچوں کے لیے اردو میں ابتدائی تعلیم کا انتظام

سرے سے قابل اطمینان نہیں ہے یعنی عمل میں یہ ہوتا ہے کہ شروع سے طالب علم ہندی لازمی طور پر پڑھتا ہے۔ اس کے بعد انگریزی لازمی طور پر اور چھٹے درجے سے تیسری زبان کے طور پر سنسکرت کی پڑھائی کا عام طور پر انتظام ہوتا ہے، اردو کا بہت کم۔ غیر ہندی ریاستوں میں وہ اردو پڑھ لیتا ہے، مگر اسے اس علاقے کی زبان اور سرکاری زبان بھی سیکھنی ہوتی ہے اور انگریزی بھی اس کے علاوہ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ ہندی بھی سیکھ لے۔ اس طرح سہ لسانی فارمولا عملاً اس کے لیے چہار لسانی فارمولا ہو جاتا ہے، ہاں اگر وہ اردو نہ پڑھے تو پھر تین زبانوں کا پڑھنا لازمی ہوتا ہے۔ ہندی ریاستوں میں اگر کہیں کہیں اردو کو تیسری زبان کے طور پر پڑھایا بھی جاتا ہے تو شاید آئندہ چونکہ کسی جنوبی ہند کی زبان کے پڑھانے پر ملک کی یکجہتی کی خاطر اصرار ہوگا تو پھر یا تو وہ چار زبانیں پڑھے یا اردو کو مجبوراً چھوڑے۔ اس لیے ہماری رائے میں پہلا کام تو یہ کرنا چاہیے کہ پرائمری منزل پر انگریزی بالکل نہ پڑھائی جائے، انگریزی آٹھویں درجے سے شروع اور لازمی ہو۔ ان لوگوں کے لیے جن کی مادری زبان علاقائی زبان ہے دوسری زبان کے طور پر پانچویں درجے سے کسی دوسری جدید ہندوستانی زبان کا پڑھنا لازمی ہو جن کی مادری زبان علاقائی زبان نہیں ہے مثلاً اردو جن کی مادری زبان ہے وہ علاقائی زبان پانچویں درجے سے پڑھیں اور ان سے اس کے علاوہ انگریزی بھی پڑھیں۔ جو لوگ اردو کسی وجہ سے چھٹے درجے تک نہیں پڑھ سکے ہیں اور علاقائی زبان یا سرکاری زبان پڑھ چکے ہیں وہ پانچویں درجے سے اردو پڑھیں۔ جنوبی ہند میں اردو مادری زبان کی حیثیت سے پڑھنے والے، پانچویں درجے سے علاقائی زبان پڑھیں، آٹھویں درجے سے سب کے ساتھ انگریزی پڑھیں۔ ہندی اختیاری طور پر چاہیں تو اس کے علاوہ پڑھ سکتے ہیں۔

مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہر حال میں تمام بچوں کو سب سے پہلے مادری زبان پڑھنے کا موقع ملے۔ اس کے بعد اگر علاقائی زبان مادری زبان کے علاوہ ہے تو اس کے پڑھنے کا اور آخر میں مرکز کی دوسری سرکاری زبان انگریزی کا۔ اس معاملے میں اگر تنگ نظری سے کام نہ لیا جائے اور مالی دشواریوں یا فرضی دقتوں کا حوالہ نہ دیا جائے تو لسانی اقلیتوں کے بنیادی مطالبات کا لحاظ بھی ہو سکتا ہے، تعلیمی ضروریات بھی پوری ہو سکتی ہیں اور قومی یکجہتی کے مقاصد بھی۔ ہاں اگر ریاستی زبان یا مرکز کی سرکاری زبان یا دوسری سرکاری زبان یا سنسکرت سب پر اس طرح لادی گئی کہ خواہ مادری زبان پڑھائی جائے یا نہ پڑھی جائے، یہ زبانیں ضرور پڑھا دی جائیں تو ظاہر ہے کہ لسانی اقلیتوں کو بجا طور پر شکایت ہوگی۔ بہرحال کوٹھاری کمیشن کی سفارشات پر ایمانداری سے عمل کیا جائے اور اس کے تین فارمولے میں مخصوص مقاصد کے تحت لچک نہ پیدا کی جائے تو اب بھی تین زبانیں اس طرح پڑھائی جا سکتی ہیں کہ ابتدا سے مادری زبان، پانچویں درجے سے اس کے ساتھ دوسری زبان اور آٹھویں درجے سے اس کے ساتھ تیسری زبان۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ارباب اختیار جو لچک پیدا کرنے اور ہر فارمولے کو توڑ مروڑ کر اپنے سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، اس فارمولے کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔

غالب صد سالہ جشن کمیٹی کے عہدیداروں کا اعلان

لکھنؤ، شری اگرسین، صدر غالب صد سالہ جشن کمیٹی نے حسب ذیل عہدیداروں کو نامزد کیا ہے۔ صدر جناب اگرسین ایم ایل اے (دیوریا) نائب صدر پروفیسر احتشام حسین (الہ آباد) ڈاکٹر امرت لال عشرت (بنارس) جناب بھگوتی چرن ورما (لکھنؤ) میکش اکبرآبادی اور جناب ایم اے رضوی (کانپور)، جنرل سکریٹری۔ جناب پی ایس سیٹھی (کانپور) جوائنٹ سکریٹری نذیر بنارسی، ڈاکٹر راجندر ادستھی اور نشور واحدی خزانچی۔ دو سکریٹریوں اور پانچ ممبران مجلس عاملہ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

پروگرام کے مطابق غالب پر اردو ہندی میں کتابیں مرتب کی جائیں گی اردو کمیٹی میں پروفیسر احتشام حسین، ڈاکٹر رضیب حسین، جناب پی ایس سیٹھی اور ڈاکٹر امرت لال عشرت (کنوینر) ہوں گے۔ جب کہ ہندی کمیٹی میں ڈاکٹر بھگوت سرن اپادھیا جناب بھگوتی چرن ورما ٹھاکر پرشاد سنگھ اور ڈاکٹر راجندر ادستھی (کنوینر) ہوں گے۔

غالب صد سالہ جشن کے سلسلے میں کلچرل کمیٹی اور مشاعرہ کمیٹی کے بالترتیب کرنل موہن اور پنڈت آنند نرائن ملا کنوینر بنائے گئے ہیں اس موقع پر ایک سیمینار بھی ہوگا جس کے انتظامات کے لیے حسب ذیل حضرات پر مشتمل کمیٹی بنائی گئی ہے۔ بیگم حامدہ حبیب اللہ، ڈاکٹر راجندر ادستھی، جناب مقبول احمد لاری، منظر سلیم اور پی ایس سیٹھی (کنوینر)۔

غالب صد سالہ کمیٹی طلبہ کے لیے ایک انعامی مقابلہ بھی کرائے گی اور طلبہ سے غالب کے کلام پر خاص مضامین لکھائے جائیں گے۔

(قومی آواز)

امید چند بہار

رباعی

یہ کینہ، یہ سازشیں، یہ پندار، یہ جھوٹ
یہ بیر، یہ تفرقے، فسادات، یہ پھوٹ
کیا جانیے کب تک رہے یہ صورت حال
اس ملک میں ہو رہی ہے کیا لوٹ کھسوٹ!

ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی

جدید عربی ادب میں آزاد شاعری کا ارتقا

جدید عربی شاعری کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں ایک اجتماعی فکر کا جلوہ ہر جگہ نظر آتا ہے۔ شعراء نے قومی حوادث و واقعات سے مواد اخذ کر کے اپنی شاعری کو حسن و رعنائی بخشی ہے۔ انھوں نے مغربی ادب کی تحریکوں سے طرز بیان اور طرز فکر دونوں میں کسب فیض کیا ہے مثلاً پہلی اور دوسری عالمگیر جنگ کے دوران لبنانی شعراء نے جو اشعار کہے ان پر تحریک رمزیت کے اثرات بڑی وضاحت سے ملتے ہیں اسی طرح سرائیلزم کی علامتیں بھی بعض عرب شعراء کے کلام میں نظر آتی ہیں۔ نفسیات اور لاشعور کے نظریات کے زیر اثر سرائیلزم کی تحریک شروع ہوئی۔ انگریزی کے اس لفظ کا مطلب ہے فوق الواقع یا حقائق سے آگے کی بات۔ عرب شعراء کے ایک محدود طبقہ نے اس طرز فکر سے تاثر قبول کیا مگر یہاں یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ عربی شاعری ہمیشہ سے حقیقت پسند رہی ہے یہ تحریک بنیادی طور پر اس کی فطرت کے خلاف ہے اس لیے اس کو عربوں میں کبھی قبول عام حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان جدید تحریکوں کا ذکر اس بنا پر ضروری ہے کہ انھوں نے نتیجۃً عربی شاعری کی ہیئت و شکل پر بھی اثر ڈالا ہے اور خیالات کو تو بالکل ہی تبدیل کر دیا ہے۔

جدید عربی شاعری میں دو طرز کے شعرا نظر آتے ہیں۔ ایک طبقہ تو نظم کی قدیم تقسیمات اوزان اور بحور پر سختی سے عامل ہے مگر دوسرا طبقہ مغربی شاعری کی اشکال پر فریفتہ ہے جس انداز کے قوافی یورپی شاعری میں استعمال ہوتے ہیں اسی طرز کا تتبع یہ لوگ عربی میں بھی کرتے ہیں، بلکہ خاصے لوگ ایسے بھی ہیں جو آزاد اور معری شاعری کے دلدادہ ہیں۔ البتہ یہاں ایک امر اور قابل لحاظ ہے وہ یہ کہ تجدد کی بعض شکلیں عربی ذوق سے بڑی ہم آہنگی رکھتی ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ قافیے کی پابندی میں بعض شعراء ذرا آزادی سے کام لیتے ہیں مثال کے طور پر پہلے شعر اور تیسرے شعر کا قافیہ یکساں ہوتا ہے اور دوسرے شعر و چوتھے شعر کا قافیہ ہم آہنگ ہوتا ہے۔ لیکن وہ شکل جس میں قافیہ بالکل متروک کر دیا جاتا ہے وہ عربی مذاق کے قطعاً خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس طرز شاعری میں عربوں کی صدیوں کی روایت سے بغاوت ہے اس میں مغرب کی نقالی کے سوا کچھ نہیں اسی بنا پر اس کو قبول عام کی سند حاصل نہ ہو سکی۔ دور جدید کی ابتدا سے لے کر اب تک بہت سے شعراء نے اس جانب دعوت دی مگر تمام کوششوں کا نتیجہ ناکامی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ سید توفیق البکری اپنے قصیدہ "ذات القوافی" میں آزاد وغیرہ مقفیٰ شاعری کی دعوت دیتے ہیں۔ عبدالرحمٰن شکری، جمیل صدقی زہاوی اور احمد زکی ابوشادی جیسے اہم شعراء تک عربوں کو اس طرف بلاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے کسی کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور نہ وہ عوام کے مذاق کو بدل سکے۔

آزاد شاعری میں محض یہ نہیں کہ قافیہ نہیں ہوتا بلکہ عروض کی تمام پابندیوں سے وہ آزاد ہوتی ہے۔ ایک شعر میں صرف ایک وزن مثلاً مفاعیلن ہوتا ہے لیکن دوسرے شعر میں تین بار مفاعیلن آسکتا ہے یا اس سے بھی زیادہ بار۔ یعنی بلا کسی قید کے مختلف اوزان پر مختلف تعداد سے مصرعے آسکتے ہیں[1]

مصطفےٰ صادق الرافعی آزاد شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ ہمارے دور میں ایک طرز شاعری ایسا نکلا ہے جس کا نام شعر منثور رکھا جاتا ہے۔ یہ نام خود اس کے نام رکھنے والے کی جہالت کا اعلان کرتا ہے۔ شعر منثور سے یہ بہت بہتر ہے کہ جس کا دل چاہے اپنی باتیں یا اپنا مافی الضمیر نثر میں پیش کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی شاعری بڑی نزاکت کی حامل ہے۔ موسیقی کے ہوتے ہوئے بھی اگر ادنیٰ سی کمزوری کسی پہلو سے رہ جائے تو اس کی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس نثر ہر قسم کے عیب کو برداشت کر لیتی ہے۔ اگر کوئی شعر منثور کا نام لے تو سمجھ جاؤ کہ اگرچہ وہ شاعری کرنے سے عاجز ہے مگر پھر بھی ایک دوسرے انداز سے دعوائے شاعری کر رہا ہے[2]

بیسویں صدی میں جب عربوں پر مغربی ادب کے بھرپور اثرات مرتب ہوئے تو انھوں نے قصائد کو بھی مختلف قطعات میں نظم کیا جس میں کبھی اشعار باہم مختلف ہوتے اور کبھی متفق۔ ہر ٹکڑے کے قوافی دوسرے سے جدا ہوتے۔ بعضوں نے مغربی اصول کے طرز پر دوہرے قافیے استعمال کیے۔ ان کے ٹکڑے بھی اسی انداز پر پیش کیے اور ایسی بحروں کو ترجیح دی جو ہلکی و دلکش ہوں۔ بعضوں نے وزن اور قافیوں کو خیرباد کہا اور بعض شعراء نے وزن کو تو قائم رکھا مگر قافیہ کو اڑا دیا۔ جن اشعار میں قوافی باقی رہے اور وزن غائب ہو گیا ان کا نام شعر منثور رکھا گیا اور جن اشعار میں وزن قائم رہا مگر قوافی غائب ہو گئے ان کو شعر مرسل کہا گیا۔ ایسے اشعار میں کسی مخصوص بحر، وزن اور قافیہ کی پابندی نہیں ہوتی۔ ہاں وزن کسی نہ کسی شکل میں ضرور باقی رہتا ہے۔ شکری کے مجموعۂ کلام "ضوء الفجر" میں ایسے اشعار مل جاتے ہیں۔ چند اشعار بطور نمونہ کے ملاحظہ ہوں:۔

ولولا خدعة الآمال ترجى ۔۔۔ لأسلمنا النفوس الى الحمام

اگر امید کا دھوکہ نہ ہوتا تو ہم اپنے نفسوں کو موت کے سپرد کر دیتے

بكاني انني احد وغريبا ۔۔۔ وحولي معشري وبنو ودادي

میرا رونا یہ ہے کہ میں اجنبی ہوں حالانکہ میرے گرد میرے کنبے والے اور محبت والے ہیں

---

[1] مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الادب المعاصر فی مصر مصنفہ شوقی ضیف

[2] فی الادب الحدیث ج ۱ مصنفہ عمر الدسوقی ص ۲۲۹

مکاثی ان فی الدنیا امورا یضیق بمثلہا الصدر الرحیب

میرا دونا یہ ہے کہ دنیا میں ایسے معاملات ہیں جن سے وسیع سینہ رکھنے والا بھی تنگی محسوس کرتا ہے[۱]

"الشعر الحر" یعنی آزاد شاعری بھی اسی قسم کی چیز ہے جس میں بحر کا اہتمام نہیں ہوتا بلکہ وزن میں "تفعلہ" پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بحر کے مقررہ وزن سے قطع نظر شاعر حسب مرضی کوئی وزن اختیار کر لیتا ہے اور قوافی بالکل چھوڑ دیتا ہے۔ مقبولیت اس طرز کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان تمام طرزہائے شاعری کو کسی عظیم شاعر کا دامن نہ مل سکا، حافظ و شوقی ان کے قریب نہ گئے۔ مطران و شکری نے اس طرز کو کہیں کہیں اختیار کیا ہے مگر ان کے بعد اس درجے کے شعرا بھی اس جانب متوجہ نہ ہوئے۔ اس طرز شاعری میں جو چیز کھٹکتی ہے وہ جمالیاتی عنصر کی کمی اور ترنم و موسیقی کی کیفیت کا فقدان ہے۔ کبھی کبھی تو آزاد شاعری بالکل مضحکہ خیز ہو جاتی ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شاعر ایک گہرے اور اعلیٰ شعور سے ایک بالکل سطحی تخیل کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور کبھی الفاظ کی تکرار شعر کو مکدر کر دیتی ہے۔ آزاد شاعری کا بڑا عیب ناہمواری ہے۔

آزاد نظم میں ایک طریقہ اور رائج ہے یعنی شاعر نہ وزن استعمال کرتا ہے اور نہ قافیہ۔ یہ سب سے ناکام اور شاعری کی بدترین شکل ہے خصوصاً فقدان وزن تو شعر کی موت ہے۔ اگر اس کو شاعری کہا جا سکتا ہے تو پھر ابن عمید اور صاحب بن عباد وغیرہ کا پورا نثری سرمایہ سب شاعری تھا جس میں حسین تشبیہات اور دلکش استعارے موجود ہیں اور روانی کا یہ عالم محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ندی بہ رہی ہو اور ابل رہی ہو۔ جدید شعرا بھی استعاروں اور تشبیہات سے اپنے کلام کو پُر کر دیتے ہیں لیکن ان کے استعاروں میں کچا ذہن اور ناپختہ شعور ملتا ہے۔ اس قسم کی شاعری میں کشش، جذبہ اور اثر کی کمی محسوس ہوتی ہے حالانکہ یہی عناصر شاعری کو زندگی اور تابندگی عطا کرتے ہیں۔

امریکہ میں رہنے والے عرب مہاجر شعرا نے سب سے پہلے اس طرز کی آزاد شاعری کا آغاز کیا۔ ابو شادی نے اپنے بعض اشعار بلکہ نظموں میں ان شعرا سے تاثر قبول کیا۔ بالکل جدید زمانہ میں تو بہت سے شعرا اس راہ پر گامزن نظر آتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اس طرح حشو، قافیہ کی غرابت اور تکرار سے شاعری کا دامن پاک ہو جاتا ہے مگر ان کی تمام دلیلیں باطل ثابت ہوتی ہیں اس لیے کہ اولاً تو عوام اب تک آزاد نظم کو پسند نہیں کرتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ عربی شاعری ایک غنائی شاعری ہے لیکن آزاد شاعری میں غنائیت کی واضح طور پر کمی محسوس ہوتی ہے۔ عربی شاعری خود اتنی قدیم اور ترقی یافتہ ہے کہ اس کو مغرب کی راہ پر لے جانا اس کا گلا گھونٹنا ہے۔ مغربی طرز کی شاعری میں صرف ایک فائدہ ہے یعنی آسانی، اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ممتاز شعرا فن پر اتنی قدرت رکھتے ہیں کہ ان کے لیے عروض و قافیہ کی مشکلات کوئی اہمیت نہیں رکھتیں بلکہ قوافی وغیرہ تو ان کے لیے پانی سے زیادہ نرم اور نسیم سحر سے زیادہ خوش خرام بن جاتے ہیں۔ وزن، بحر اور فن عروض گویا پابندیوں کے اثرات سے اشعار میں نزاکت، حسن میں تیزی، نظم میں روانی، طبیعت میں جلا اور ذوق میں لطافت پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ وزن، قافیہ اور بحر کے باعث اشعار کے حفظ کرنے میں آسانی ہوتی ہے[۲]

یہ خیال سرے سے باطل ہے کہ عربی شاعری میں قافیہ کا استعمال ثقل کا باعث ہے اور بے کار ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان الفاظ کا عظیم ذخیرہ اپنے جلو میں رکھتی ہے۔ شاعر کا اولین فرض ہے کہ وہ اس ذخیرہ تک رسائی حاصل کرے۔ پھر اس کے بعد قوافی کا انتخاب کوئی مسئلہ بن کر اس کے سامنے نہیں آتا۔ عربی شاعری کی طویل زندگی میں کبھی کسی شاعر پر قافیہ کے وجود نے گرانی نہیں کی حتیٰ کہ "عہد نہضہ" کے شعرائے محافظین نے بعض طویل تر نظمیں لکھیں اور اس قافیہ کی پابندیوں کے ساتھ مثلاً سلیمان بستانی نے ہومر کی ایلیڈ کا ترجمہ کیا اور شوقی نے طویل ڈرامے نظم کے قالب میں ڈھالے۔ حق یہ ہے کہ قلب انسانی پر موزوں و مقفیٰ اشعار کا اثر بہ نسبت آزاد شاعری کے زیادہ ہوتا ہے۔

بہرحال قصص شاعری میں یا عام جدید مضامین کے لیے اگر آزاد نظم کو ذریعہ اظہار بنایا جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں مگر عربی قصائد و تشبیب میں اس طرز شاعری کا استعمال نہایت قبیح و نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

[۱] فی الادب الحدیث ج ۱ صفحہ ۳۰۰-۳۰۲

[۲] ملاحظہ ہو الادب العربی المعاصر مصنفہ شوقی ضیف مطبوعہ قاہرہ مصر

خلیل الرحمن اعظمی

رفتار

پاکستان کے ممتاز شاعر سلیم احمد کی غزلوں کا مجموعہ "بیاض" بھی حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ یہ ان معدودے چند مجموعوں میں سے ہے جن کے دیکھنے اور پڑھنے کی طلب ہر وہ شخص محسوس کرے گا جسے موجودہ دور کے ادبی رجحانات سے دلچسپی ہے اور پھر سلیم احمد ان لوگوں میں نہیں ہیں جو "شاعر محض" کی حیثیت رکھتے ہوں، جن کے بارے میں بہت افراط کے طور پر دو ایک کلمۂ خیر کہتے یا جن جن قسم کی رائے دینے سے ہی کام چل جائے اس لیے کہ ان کے کچھ مضامین مثلاً "نئی نظم اور پورا آدمی" یا "غزل، منظر اور ہندوستان" ابھی کچھ ہی دنوں پہلے ادبی حلقوں میں فتنہ و فساد کا سبب بن چکے ہیں۔ ویسے ان مضامین کی بعض لوگوں نے بے حد تعریف کی ہے اور اردو کی نئی تنقید میں سلیم احمد کی ان تحریروں کو ایک نئے امکان سے تعبیر کیا ہے مثلاً ن۔ م۔ راشد نے اپنے ایک مضمون نما طویل خط کے ذریعہ ان مضامین کی کھل کر داد دی ہے۔ یہ خط "نیا دور" کراچی میں شائع ہو چکا ہے) اور پاکستان کے مشہور نقاد اور انشائیہ نگار نظیر صدیقی کا کہنا ہے کہ "یہ انداز نظر مغربی تنقید کے کسی اصول یا نظریے کو مشرقی ادب پر چپکا دینے کا نتیجہ نہیں بلکہ ذاتی غور و فکر کا ایک ایسا انعام ہے جو سلیم احمد ہی کے لیے مقدر تھا۔"

لیکن ان چند مخصوص رایوں سے قطع نظر سلیم احمد کے یہ مضامین ادیبوں اور شاعروں کے حلقے میں خاصے دنوں تک زیر بحث رہ چکے ہیں اور ان کے نقطۂ نظر اور اسلوب تحریر دونوں سے بڑی حد تک اختلاف کیا گیا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ سلیم احمد کے خیالات سے متفق نہ ہوتے ہوئے بھی ان کی ذہانت و طباعی، ان کی غیر معمولی سوجھ بوجھ اور مطالعہ کے وسیع مطالعے کی داد دینی پڑتی ہے۔ انھوں نے حالی سے لے کر حال تک کی اردو نظم کے متعلق بعض ایسے سوالات اٹھائے ہیں جن پر غور کیے بغیر ہم اپنی شاعری میں کوئی نتیجہ خیز تبدیلی نہیں لا سکتے۔ مثلاً ان کا یہ خیال کہ غدر کے بعد ہمارے معاشرے کا پورا آدمی ٹوٹ پھوٹ کر سیاسی، اخلاقی، اصلاحی اور رومانی آدمی بن گیا جس کے نتیجے میں ہماری شاعری چند مفروضوں اور فارمولوں کی اسیر ہو کر زندگی کی نامیاتی وحدت سے اپنا رشتہ توڑ بیٹھی۔ ان کا دوسرا اہم نکتہ غزل کے متعلق ہے۔ سلیم احمد کہتے ہیں "زلزلہ صفحۂ جیف پر گرتا ہے لیکن اردو شاعری کی پچھلی سو سالہ تاریخ میں عضو ضعیف پر نہیں بلکہ گرا ہے یعنی غزل پر۔ غدر کے ہنگامے میں انگریزوں سے مار کھانے کے بعد روشن خیال مسلمانوں کو اپنی جو چیز سب سے بری لگی وہ یہی بدنام صنف سخن تھی۔"

سلیم احمد کے ان دونوں مضامین میں انتہا پسندی کے باوجود بعض ایسی پتے کی باتیں ہیں جن سے واقف ہونا ہر اس شخص کے لیے ضروری ہے جسے اپنی زبان اور اپنے ادب کی اصناف سے دلچسپی اور انھیں آگے بڑھانے کی تمنا ہے۔

سلیم احمد کا سب سے اہم کارنامہ میرے نزدیک غزل کی اہمیت اور معنویت کو از سر نو دریافت کرنا اور اسے نئے ذہن سے قریب لانے کی کوشش ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے اس غزل کی بھی قلعی کھولی ہے جس پر "رومانی آدمی" کی چھاپ ہے۔ سلیم احمد کے نزدیک یہ غزل زندگی کی صداقتوں سے گریز کر کے ایک مصنوعی اور فرضی دنیا میں پناہ لیتی ہے۔ ہماری تنقید نے عام طور پر صرف اس غزل کو مطعون کیا تھا جو زبان اور محاورے کے بل پر اور ردیف و قافیہ کی الٹ پھیر سے تیار ہوتی ہے اور جسے ہمارے یہاں "استادانہ غزل" کہتے ہیں پچھلے دنوں نوح ناروی اس طرز کے سب سے بڑے نمائندہ تھے۔ لیکن سلیم احمد نے اس غزل کو بھی جھوٹی اور بناوٹی قرار دیا ہے جس میں بظاہر "جذبات" نظر آتے ہیں لیکن یہ "جذبات" بھی رسمی ہوتے ہیں یہ "جذبات" زندگی کے حقیقی تجربے سے برآمد نہیں ہوتے بلکہ محض شاعری کرنے کے لیے اوپر سے اوڑھ لیے جاتے ہیں کیونکہ بزرگوں نے کہا ہے کہ شاعری کے لیے "سوز و گداز" ضروری ہے۔ عشق و

اشفاق احمد اعظمی

غزل

اے یار اب کدھر ہے تری فکر کا بہاؤ
ڈھلوان ہی کی سمت کہ جس سمت ہے چڑھاؤ
ڈوبی ہوئی ہے قلزمِ خوں میں نئی سڑک
جی چاہتا ہے خود بھی اسی طرح ڈوب جاؤ
آتی ہے ہر طرف سے وہی موت کی صدا
باجا بجاؤ جنگ کا یا سازِ دل اٹھاؤ
بیٹھی ہے سر جھکائے ہوئے شام ہی سے زیست
تاروں کی انجمن میں اسے بھی کوئی بلاؤ
طوفان کی لپیٹ میں تلوار توڑ کر
خود آ گئی بھنور میں مری زندگی کی ناؤ
یہ ریت کا مکان نہیں قصرِ فکر ہے
اے سرپھری ہواؤ! کناروں پہ لوٹ جاؤ
بیٹھو ہمارے پاس ابھی سرد ہے فضا
کچھ کم نہیں ہے "رات کے کوڑے" کا یہ الاؤ
اشفاق کی جوان امنگوں کا مرثیہ
لکھیں گے کل کے لوگ، مرے ہمصفیر جاؤ

محبت کی چوٹ کھانا بھی شعر کہنے کے لیے لازمی ہے" وغیرہ وغیرہ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے غزل گویوں نے برائے شعر گفتن سوز و گداز پیدا کرنے کی کوشش کی، عاشق کا سوانگ رچایا۔ چنانچہ ان کی غزل کو ذرا سا کُریدا جائے تو جعلی سکّے کی طرح اس کی حقیقت سامنے آجاتی ہے۔

اس بحث کی تھوڑی سی تمہید بیان کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ سلیم احمد کے ان خیالات سے واقف ہوئے بغیر خود ان کی غزلوں کے ذائقے سے ہم پورے طور پر لذت اندوز نہیں ہو سکتے۔ غیر رومانی غزل کا یہ نظریہ اور غزل کا وہ کھردرا لہجہ جسے سلیم احمد نے برتنے کی کوشش کی ہے اس سے پہلے یگانہ اور شاد عارفی کے توسط سے ہمارے سامنے آ چکا تھا البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یگانہ اور شاد نے اپنے شعری رویے کے لیے کوئی مستحکم تنقیدی نظریہ بنانے یا منوانے کی کوشش نہیں کی۔ سلیم احمد نہ صرف اپنے مضامین کے ذریعہ بلکہ بعض اشعار کے ذریعہ بھی اسے ایک ادبی نظریے کی صورت دینا چاہتے ہیں۔

سلیم احمد نے جن اشعار کے ذریعہ رومانی غزل پر تنقید اور اپنی غزل کا جواز پیش کرنے کی کوشش کی ہے ان کی مثالیں یہ ہیں:۔

بوسیدہ ہو چکی ہے یہ جذبات کی قبا — حسنِ غزل کو ٹاٹ کا گوٹا لگا ہوا

لباس درد بھی پہنے آیا — یہ کپڑے اب پرانے ہو چکے ہیں

دل ہے شاید درد سے خالی سلیم — آپ کا لہجہ بہت غمناک ہے

تاج کو شوروں کا پہن کر سنگ و آہن جھیل کر
حضرتِ دل آئے ہیں الفت کا ناٹک کھیل کر

تنگ آ گیا ہوں جھوٹے نگینوں کے کام سے
حسنِ بیاں وہ دے کہ حقیقت کہیں جسے

اُترن پرانی فکر کی بکتی ہے شہر میں
سونی پڑی ہے تازہ خیالات کی دکاں

وہ دن گئے جب خیر سے تھا شوقِ نگارش
اب اپنی غزل گوئی ہے جذبات کی خارش

گانٹھتے ہیں پھٹے ہوئے جذبات — ہو گئے سب بے سلیم چمار

عشق میں اور تو کیا ہونا تھا — ایک مجموعہ کی تالیف ہوئی

آخری شعر پر بے اختیار حسرت موہانی کا یہ شعر یاد آیا:۔

حسرت جو کاروبارِ محبت یونہی رہا
سن لو گے ہم بھی صاحبِ دیوان ہو گئے

حسرت نے جو بات فخر کے طور پر کہی تھی سلیم احمد کے یہاں اس پر طنز اور حقارت کا رویّہ ہے۔ سلیم احمد کے غیر رومانی اور حسرت کے رومانی تصورِ شعر کا فرق اس سے ظاہر ہو جاتا ہے۔

اب کچھ شعر ایسے بھی دیکھ لیں جن سے اندازہ ہو کہ سلیم احمد خود اپنی شاعری کے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں:۔

حقیقت کو مکمل دیکھنا ہے — نظر کے رُخ بدلتا جا رہا ہوں

گونگی ہے ازل سے جو حقیقت — میں اس کو زبان دے رہا ہوں

الفاظ پہ جا کہ بیاں گو نیا نہیں — یہ ماجرا وہ ہے جو کسی نے سنا نہیں

ان تمام دعووں کو جب ہم اپنے سامنے رکھتے ہیں تو سلیم احمد کے مجموعے سے فطری طور پر ہم بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ جو حقیقت ازل سے اب تک گونگی ہے اس کو زبان دینا واقعی بہت بڑا کام ہے اور اگر کوئی اس کام کا ارادہ کر لے اور اس میں ناکام ہو جائے تو اس کی ناکامی بھی شاندار ہوگی۔ افسوس ہے کہ اس اعتبار سے سلیم احمد کا یہ مجموعہ ہمیں مایوس کرتا ہے کیونکہ سلیم احمد نے اپنے گنے چنے چند اشعار میں جنس کو موضوع بنایا ہے لیکن وہ اس باب میں ہمارے پرانے ریختی گو شعرا سے آگے نہ جا سکے۔ مثلاً ان کی ایک غزل یوں شروع ہوتی ہے:

دھرا کیا ہے زبانی پیار کے رنگیں فسانوں میں
کھرے کھوٹے کا سب احوال کھل جائے گا رانوں میں

تو ہم چونکتے ہیں کہ شاید جنسی بیباکی کا نیا انداز میں شاعر ہمارے سامنے آ رہا ہے لیکن اگلے ہی شعر سے سلیم احمد پھر رمز و ایما کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور پھر وہی غزلیت سامنے آتی ہے:۔

جواں بدمست راتیں سانس بھی آہستہ لیتی ہیں
لہو سرگوشیاں کرتا ہے سرشاری کے کانوں میں
سمٹ آتی ہے روحِ بے قراری ایک نقطے پر
وہ نقطہ مثلِ ساعت پھیلتا جاتا ہے جانوں میں
سحر ہونے پہ گونگا تجربہ محسوس کرتا ہے
کہ رچ کر رہ گیا ہے ذائقہ خوں کا زبانوں میں

یہ اشعار بہت خوبصورت اور جاندار ہیں لیکن سلیم احمد نے جو سرا اٹھایا تھا اسے آگے نہ لے جا سکے۔ اسی طرح اس مجموعے میں مشکل سے چھ سات غزلیں ایسی ہیں جن میں سلیم احمد نے اپنی دانست میں اپنے قاری کے ذہن کو دھچکا پہنچانے کی کوشش کی ہے لیکن دو ایک شعر کے بعد وہ پھر سنجیدہ ہو جاتے ہیں یا پھر جرأت و رنگین کی تقلید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلیم احمد نے اس شعری مزاج کو

اپنانے کی شعوری کوشش کی ہے اور غزل میں اجتہاد کی خاطر باقاعدہ منصوبہ بندی سے کام لیا ہے اس لیے وہ اس میدان میں زیادہ پھیل پھول نہ سکے اور ان کی حیثیت محض منھ کا مزا بدلنے کی ایک کوشش بن کر رہ گئی۔ جب قاری ان کی کتاب کے فلیپ پر یہ تحریر پڑھتا ہے کہ

"شعر و ادب کے پڑھنے والے کو بالغ اور نڈر ہونا چاہیے
... میں نے جو کچھ کہا ہے بے خوفی سے کہا ہے۔ میں
اپنے پڑھنے والوں سے بھی اسی بے خوفی کی امید رکھتا
ہوں"

تو خیال گزرتا ہے کہ یہ بے حد خوفناک مجموعہ ہوگا لیکن اس پر کچھ ہی دیر کے بعد یہ حقیقت روشن ہو جاتی ہے کہ یہ اندیشہ بے بنیاد تھا۔ یہ مجموعہ تو بہت ہی بے ضرر قسم کا ہے۔ جن دس پانچ اشعار میں بے خوفی اختیار کی گئی ہے اس میں بھی ہمارا شاعر بے خوفی کی اس روایت سے کوسوں پیچھے رہ گیا ہے جو انشا، نظیر، میر، سودا اور دوسرے بہت سے شعرا کے یہاں واشگاف انداز میں موجود ہے۔ اور فراق کے یہاں خاصی رچی ہوئی صورت میں۔

میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ سلیم احمد نے اس تجربے سے پہلے جو غزلیں لکھی ہیں وہی ان کے مزاج سے مناسبت رکھتی ہیں۔ ان غزلوں میں یگانہ اور فراق کے لہجوں کی ملی جلی سی کیفیت ہے، کچھ غزل کی دیرینہ رمزیت ہے اور کچھ نئے ذہنی رویے کا عکس۔ ان غزلوں میں ہمیں غزل کا ایک مانوس لہجہ اور معیار بھی ملتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ تازگی کا بھی احساس ہوتا ہے۔ ان کے چند اچھے شعر یہ ہیں :-

شاید کوئی بندۂ خدا آئے	صحرا میں اذان دے رہا ہوں

چلا ہے مجھ سے آگے میرا سایہ	سو میں بھی ساتھ چلتا جا رہا ہوں
یہ جی جاہا تھا پتھر بن کے جی لوں	سو اندر سے پگھلتا جا رہا ہوں

سلیم ہم بھی سفینے کے بادباں کھولیں
اُٹھے جو موج کوئی دل ابھارنے والی

بین کرتی ہے دریچوں میں ہوا	رقص کرتی ہیں سیہ پرچھائیاں

غرور تشنہ لبی نے سراب ہی سمجھا	نظر کے سامنے دریا سے بہ رہا تھا

سائے کو سائے میں گم ہوتے تو دیکھا سب نے
یہ بھی دیکھو کہ تمھیں ہم نے بھلایا کیسا

آسماں صد ہزار آنکھوں سے	کس کی جانب ازل سے نگراں

میں کر رہا ہوں تری چشم نم سے اندازہ	کہ آنے والے زمانے بہت حسیں ہوں گے

ریاکاری جبیں نے سیکھ لی ہے	کوئی حالت ہو یہ ہنستے رہیں گے

غرورِ گم رہناں دیکھ کر یہ راز کھلا	غرور سایۂ معکوس ہے ندامت کا

سلیم احمد کی غزل کا یہ لہجہ دراصل جدید غزل کا لہجہ ہے۔ یہ وہ غزل ہے جو یگانہ اور فراق کی روایت کو اپناتے ہوئے بھی اس سے آگے کی چیز ہے لیکن سلیم احمد نے اپنے اس رنگ کو زیادہ ابھارنے اور چمکانے کی کوشش نہیں کی۔ ان کی بہت سی روایتی لہجے کی غزلوں میں اکا دکا اس قسم کے اشعار دیکھ کر یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ کاش سلیم احمد اسی راستے سے اپنی منزل کو پانے کی کوشش کرتے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کی پوری پوری غزلیں اسی لہجے میں ڈوبی ہوتیں اور ان کے مجموعے پر اسی رنگ کی چھاپ ہوتی۔ غزل کے اس نئے لہجے کو موجودہ دور میں ظفر اقبال، شکیب جلالی، احمد مشتاق، اطہر نفیس، ساقی فاروقی، محمد علوی، شہریار، عادل منصوری، شمیم حنفی، پرکاش فکری، مظفر حنفی، بشیر بدر، بمل کرشن اشک اور دوسرے بہت سے شاعروں نے آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے اور یہی دراصل اس دور کی غزل کا حقیقی لہجہ ہے۔ سلیم احمد کے لیے اب ضروری ہے کہ وہ تعقیدات مفروضوں کی فضا سے نکل کر اپنی اصل آواز کو پہچان لیں۔ وہ ان ذہین و طباع نوجوانوں میں ہیں جن کے اندر بے پناہ صلاحیت ہے اور وہ ہماری شاعری کو بہت کچھ دے سکتے ہیں۔

انیس وقر

مکتوب لندن

اپنا ہی گھر سمجھیے

۲۳ر دسمبر کے مشرق میں اس عنوان سے برمنگھم کے محمد بشیر صاحب ایک مراسلہ میں رقمطراز ہیں:۔

"برطانیہ میں اردو سمجھنے اور بولنے والے تارکین وطن کی تعداد کم از کم دو لاکھ ہوگی۔ بی بی سی ٹیلیویژن پروگرام "اپنا ہی گھر سمجھیے" "MAKE YOURSELF AT HOME" اردو والوں (جسے وہ لوگ نجانے کیوں ہندوستانی کہتے ہیں) تارکین وطن کے لیے شروع کیا گیا تھا۔ یہ ایک ایسا ذریعہ تھا جس سے ہم بہت کچھ سیکھ سکتے تھے اور برطانیہ کے شب و روز کے متعلق جان سکتے تھے۔ لیکن "اپنا گھر سمجھیے" میں وہ جان پیدا نہ ہوسکی جو ہونا چاہیے تھی۔ کافی عرصہ سے اس پروگرام میں تارکین وطن کو انگریزی سکھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ اس پروگرام میں چھوٹی چھوٹی اور عام باتیں سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے جو تارکین وطن کی اکثریت اور خاص طور پر ... پہلے ہی سے جانتی ہے۔ ہم برطانیہ میں رہتے ہیں۔ ہمیں کم از کم یہاں کے متعلق ہر ہفتہ کچھ معلوم ہونا چاہیے۔ لیکن ہفتہ کے بعد "اپنا ہی گھر سمجھیے" کو دیکھا جائے تو سوائے مایوسی کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ دو تین ریکارڈ، وہی عامیانہ قسم کا انگریزی کا سبق یا کوئی ناچ گانا۔

سچ پوچھیے تو آج تک یہی سمجھ میں نہ آسکا کہ یہ پروگرام کس طبقہ کے لیے شروع کیا گیا ہے۔ آخر اتنے مفید پروگرام کو اتنا محدود کر دینے میں کیا مصلحت ہے۔ کیا اس کو زیادہ مفید اور دلچسپ نہیں بنایا جاسکتا؟"

امید ہے کہ بی بی سی کے مہندر کول اور سلیم شاہد اس طرف توجہ دیں گے۔

۱۹۶۷ء کا برطانیہ میں اردو کا شعری سرمایہ

مشہور ہیئت داں اور ادیب میر بشیر

اس عنوان سے ایک سیر حاصل مضمون قلمبند کر رہے ہیں اور انھوں نے تمام ارباب سخن سے درخواست کی ہے کہ وہ اپنا ایسا کلام (یا اس کے نمونے) ارسال کریں جو ان حضرات نے گزشتہ سال موزوں کیا ہو۔ مضمون میں یہ خیال رکھا جائے گا کہ مختلف مقامات میں رہنے والے شعرا کا معیاری کلام تنقیدی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔ اگر کلام کے ساتھ اپنے خاص اشعار یا نظموں کا پس منظر و محرک اثرات کا بھی ذکر کیا جائے تو مناسب ہوگا۔ فوٹو اور کلام لندن کے پتہ پر طلب کیے گئے ہیں۔

انتخاب مشرق: ہم لوگ از محمد شریف بقا لندن

بے بسی کا مزار ہیں ہم لوگ — جانِ تارتار ہیں ہم لوگ
لوگ یونہی ہیں سرگراں ہم سے — ورنہ یاروں کے یار ہیں ہم لوگ
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں — اک دمِ مستعار ہیں ہم لوگ
مرنے جینے پہ اختیار کہاں! — حیف! بے اختیار ہیں ہم لوگ
ہر طرف چل رہی ہے بادِ سموم — پھر بھی صبحِ بہار ہیں ہم لوگ
ہم ہنوز آزمارہے، گرچہ — کشتۂ روزگار ہیں ہم لوگ
اک جگہ ایک پل نہیں آرام — وہ غریب الدیار ہیں ہم لوگ
آرزوؤں کا خون ہوتا ہے — حسرتوں کا مزار ہیں ہم لوگ
اس طرب گاہِ دہر میں اے بقاؔ — دیکھ سینہ فگار ہیں ہم لوگ

مراسلات

میسور میں سلطان ٹیپو کے عہد حکومت کے قبل کی دو اردو کتابیں

جناب محمد سعید عبدالخالق صاحب (عثمانیہ) نے اپنی تصنیف "میسور میں اردو" (شائع کردہ درس گاہ اردو دار المطالعہ عام معظم جاہ مارکٹ حیدرآباد دکن) کے پہلے باب "ماقبل دولت خداداد" میں دو کتابوں سے متعلق یوں لکھا ہے

"ترجمہ تنبیہ الغافلین" (۱)

ہم نے میسور میں مولوی شاہ ابوالحسن صاحب ادیب کے ہاں ایک کتاب دیکھی جو "تنبیہ الغافلین" نامی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے۔ یہ ساڑھے تین سو سال پہلے کی اردو نثر کا نمونہ ہے اور ۹۹۰ھ میں ترجمہ ہوئی۔ کاغذ اچھا ہے۔ لیکن کتابت خراب، گمان غالب ہے کہ یہ ریاست میسور کے کسی علاقہ میں لکھی گئی ہے مترجم نے کتاب کی ابتدا اس طرح کی ہے۔

"میں ایمان لایا یا خدای تعالی پر خدای تعالی ایسا ہی تمام عالم کو پیدا کیا ہے اپنے جیو سون کسی کی سلطانی سون نہیں ہوا جملہ عالم کون رزق دینہارا ہو ایمان سون ایمانی کون مانیہا سوا دھی تمام عالم کو پیدا کر نہارا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ"

"ہزار مسائل" (۲)

ہم نے ایک قلمی مخطوطہ مولوی شاہ ابوالحسن صاحب ادیب کے ہاں دیکھا جس کا نام "ہزار مسائل" ہے مصنف کا نام محمد علی ابن مخدوم صدیقی ہے اس کے اجداد کی قضات قلعہ کوپل میں تھی۔ اس نے قلعہ کوپل میں اس کا کسی فارسی کتاب سے ۱۰۵۰ھ بزبان دکھنی منظوم ترجمہ کیا چنانچہ وہ لکھتا ہے:۔

یہی ہجر کی تھی سال سنہ یو قرار — ہزار ایک سو پر تھی پنجاہ شمار
کیا اس رسالہ کو خوش انصرام — محمد علی ابن مخدوم نام
پچھل نسل صدیق کی ذات کا — کہیں شیخ بیٹے قریشے سچا
لکھیا ترجمہ کر ادس کا تھا ٹاؤں — جو ہے قلعہ کوپل نگر جس کا ناؤں

اگر اس کتاب اور قلمی مخطوطہ سے متعلق کچھ سعید صاحب یا فرزندان مولوی شاہ ابوالحسن ادیب صاحب "ہماری زبان" میں تحریر فرمائیں تو میں ممنون ہوں گا۔

(نیاز حیدر)

ڈاکٹر گیان چند کے مضمون کے بارے میں

۵ اردسمبر کے شمارے میں راجہ عروض اور میرے متعلق ڈاکٹر گیان چند کا جو طویل مضمون شایع ہوا ہے اس کا نکتہ بہ نکتہ جواب "ہماری زبان" میں دینا ناممکن ہے۔ لہذا مختصر سے مختصر الفاظ میں صرف کچھ ضروری باتیں عرض کر رہا ہوں۔

اپنے مضمون میں میں نے ڈاکٹر گیان چند کی فضیلت کی جو تعریف کی تھی اسے موصوف عالی اپنی ہجو قرار دیتے ہیں یہ ان کے اس سوء ظن کو اپنی ہجو سمجھتا ہوں۔ میری نظر ڈاکٹر گیان چند کے علمی کارناموں کا بیحد احترام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے قلم سے ایک جونسٹ قسم کا مضمون دیکھ کر مجھے تکلیف ہوئی۔

ڈاکٹر اعجاز حسین میرے بیحد محترم عنایت فرما ہیں۔ لیکن ڈاکٹر گیان چند کے مضمون کے متعلق ان کے خیال سے مجھے بالکل اتفاق نہیں۔ اعجاز صاحب بڑے بزرگ مزاج آدمی ہیں ہو سکتا ہے ان کی یہ تحریر اپنے عزیز شاگرد کی حوصلہ افزائی ہو۔

ہندی بحروں سے اردو بحروں کا اشتقاق بنیادی طور پر ایک غلط خیال ہے۔ اردو بحروں میں ایک آفاقی موزونیت ہے۔ لہذا وہ ہندی تو کیا بعض جگہ انگریزی بحروں سے مماثل نظر آنے لگتی ہیں۔ لیکن آگے بڑھتے ہی پھر دونوں کے راستے الگ ہو جاتے ہیں۔ اردو میں کوئی ہندی بحر ہے اور نہ اصولاً ہو سکتی ہے۔ سنسکرت بحروں کا خاصا حصہ اسی طرح اردو مزاج کے لیے ناموزوں ہے جیسے عربی کی خارج شدہ ۱۵ متروک بحریں۔

امیر خسرو نے ہندوستانی موسیقی میں جو توسیعات کی ہیں وہ سب ہندوستانی موسیقی کے حدود کے اندر ہیں ڈاکٹر صاحب کے مضمون میں امیر خسرو کی مثال قطعاً بے محل ہے۔

شاعری میں وہ زحافات ترک کر دیے جاتے ہیں جو خود شاعر کے ذوق کو مطبوع نہیں ہوتے۔ یہی ڈاکٹر گیان چند کو بھی کرنا چاہیے محقق طوسی خاقانی یا حزیں کی پگڑیاں اچھالنا انھیں بالکل زیب نہیں دیتا۔

میں نے جس جگہ اتباع اصول کی ضرورت پر زور دیا ہے وہیں یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ توسیع اصول کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ بشرطیکہ ثقات فن بھی ان توسیعات کو تسلیم کریں۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے بیان کو توڑ مروڑ کر میرے سفید بالوں کے سامنے اپنے سیاہ بالوں کی نمائش کرنا چاہی ہے۔ مجھے ان کی اس روش پر سخت اعتراض ہے۔ میں ترقی پسند تھا، ہوں اور رہوں گا۔ ترقی تو میرا ایمان ہے۔ میں مخالف ہوں بے راہ روی اور ضد بازی کا جو زبان اور شاعری کو تباہ کر دے گی۔

ماترے گن کر اردو بحروں کے متعلق جو خیال ڈاکٹر گیان چند نے پیش کیا ہے وہ بھی عجیب ہے۔ اردو بحور کو ماترے سے کیا واسطہ! رباعی میں بیس اور اکیس ماترے صرف انضمام کے لیے ہیں۔ رباعی کی موزونیت ماترے گن کر نہیں جانچی جاتی۔ رباعی کے پیمانوں کے مطابق بیس یا اکیس ماتروں کے باوجود بھی مصرعہ خارج از رباعی ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر گیان چند ہماری زبان کے ایک مستند محقق ہیں اور ہمیں ان سے بہت توقعات ہیں۔ میری بیحد ناچیز گذارش یہ ہے کہ اس قسم کی عروضی بحث ان کا میدان ہے اور نہ اس میں انھیں اپنا قیمتی وقت ضائع کرنا چاہیے۔

(صفدر آہ)

یہ شعر کس کا ہے

مشہور ہے کہ یہ شعر:

کیا شوخیاں ہیں ابلق لیل و نہار کی — جیتی نہیں ہے ران کسی شہسوار کی

انیس یا دبیر کا ہے۔ ہمارے زبان کا ستعمال کرنے والوں میں اگر کوئی تحقیق سے بتا سکے کہ یہ کس کا شعر ہے تو باعث ممنونیت ہوگا۔

(سجاد مرزا)

دلی ایڈمنسٹریشن کی اردو کش پالیسی کے خلاف احتجاج

دلی۔ دلی ایڈمنسٹریشن نے دلی میں اردو کے ساتھ جو ناانصافی روا رکھی ہوئی ہے، دوسرکاری کاموں میں اس کو وہ مقام نہیں دیا جا رہا ہے جو اس کا حق ہے اس پر دلی کے سابق چیف ایگزیکیٹو کونسلر میر مشتاق احمد نے احتجاج کیا ہے۔ حکومت ہند کی وزارت دفاع نے سال ہائے ماسبق کی طرح امسال بھی جشن جمہوریت کے مشاعرے کے لیے ایک کمیٹی دلی کے موجودہ چیف ایگزیکیٹو کونسلر کی صدارت میں بنائی ہے اس میں میر مشتاق احمد صاحب کو بھی ممبر بنایا تھا مگر میر صاحب نے آج اس سے استعفاء دے دیا ہے۔ میر صاحب نے اس سلسلہ میں ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ ہر سال کی طرح اس سال بھی جشن جمہوریت کے موقع پر مشاعرہ کمیٹی کی تشکیل کی گئی اور مجھے بھی اس کا ممبر نامزد کیا گیا مگر میں نے دلی کے چیف سکریٹری کی ایڈمنسٹریشن کی "اینٹی اردو" پالیسی کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے استعفیٰ دے دیا ہے۔ میر صاحب نے اس سلسلہ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ مرحوم منشری نے ۱۹۵۵ء میں اردو کو مراعات دینے کے لیے جو سرکلر دلی ایڈمنسٹریشن کو بھیجا تھا اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے۔

اردو اور پنجابی کو دلی میں دوسری زبان کا درجہ دیا جائے

نئی دلی۔ دلی میٹروپالیٹن کونسل کی کانگریس پارٹی کے لیڈر شیو چرن گپتا نے مطالبہ کیا ہے کہ اردو اور پنجابی کو دلی میں دوسری زبان کا درجہ دیا جائے۔

انھوں نے یہ مطالبہ دلی ایڈمنسٹریشن کے اس فیصلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کیا کہ وہ ۱۵/ اگست سے اپنا کام ہندی میں کرنے لگے گا۔ گپتا نے ایڈمنسٹریشن سے یہ اعلان کرنے کا مطالبہ کیا کہ وہ ہندی اختیار کرنے کی راہ کو ہموار بنانے کے لیے کون سی تدابیر اختیار کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔

اور کہا کہ دوسری زبان کا سوال کچھ عرصے سے لوگوں کے ذہن میں ہیجان پیدا کیے ہوئے ہے۔ پچھلی مردم شماری کے بموجب دلی کی ۸ فی صد آبادی اردو اور گیارہ فی صد پنجابی بولتی ہے۔ دوسری زبان کے تعین میں پنجابی کو ترجیح حاصل ہے لیکن بہت سے پنجابی بولنے والے لوگ اردو بھی جانتے ہیں۔ تنازعہ سے بچنے کے لیے پنجابی اور اردو دونوں کو دوسری زبانوں کا درجہ دے دیا جائے۔ اسٹینڈنگ کمیٹی کے چیرمین کیدارناتھ ساہنی نے بتایا کہ آئین کے گوشوارہ میں درج ۱۶ زبانوں میں سے کسی زبان میں آنے والے خط کارپوریشن کے دفتر میں قبول کیے جائیں گے لیکن ان کے جواب صرف ہندی میں دیے جائیں گے۔

انھوں نے کہا کہ ہندی سے متعلق کانگریس کے ریزولیوشن کو اب عملی جامہ پہنایا جائے گا کارپوریشن کا تقریباً نصف کام ابھی اوقات ہندی میں ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ چونکہ تمام خطوں کے لوگ راجدھانی میں رہتے ہیں اس لیے مناسب یہی ہے کہ کارپوریشن تمام ہندوستانی زبانوں میں لکھے ہوئے خط قبول کرے خواہ ان کا ہندی میں ترجمہ کرنے کے لیے الگ مرکز کیوں نہ قائم کرنا پڑے لیکن جوابات ہندی میں جائیں گے۔

بنگالی عوام اور بنگالی کے ادیب اور شاعر اردو والوں کے ساتھ ہیں

حیدرآباد۔ شری جوتش چندر گھوش نے جوبلی ہال میں کل جانتیہ بنگلہ ساہتیہ سمیلن کے اردو اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے اردو زبان اور اس کے ادب کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا اور کہا کہ یہی وہ زبان ہے جو ہندوستان کے طول و عرض میں عام طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ بنگال میں بنگالی کے بعد یہ زبان عوام کے ایک بڑے طبقے میں رائج ہے۔ اور اس زبان نے ہمارے ادب کو متاثر کیا ہے۔ یہ ایک شیریں اور وسیع زبان ہے جس کے شیدائیوں میں راجہ رام موہن رائے سے لے کر رابندر ناتھ ٹیگور تک ہزاروں نام لیے جا سکتے ہیں۔

انھوں نے اردو اور ہندی کے سوال پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح ہندی بھی قومی زبان کہلائی جا سکتی ہے لیکن وہ ایک کامیاب رابطہ کی زبان نہیں بن سکتی۔

شری انل برن گنگو پادھیائے اڈیٹر پبلیکیشن ڈویژن دلی نے اردو اور بنگالی کی مشترک قدروں کا تفصیلی جائزہ لیا اور کہا کہ بنگالی میں بیسیوں الفاظ، استعارے اور محاورے اردو کے موجود ہیں اور ان سے ہم اپنی زبان اور ادب کے حسن کو نکھارنے کا کام لیتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ بنگالی شاعر غالب، ظفر اور واجد علی شاہ سے بہت متاثر ہیں انھوں نے ٹیگور اور بعض دوسرے بنگالی شاعروں کا کلام اپنے اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا۔

انھوں نے دلی اور بنگال کے درباروں کے ذریعہ پیدا ہونے والے تہذیبی اور سماجی روابط کی تفصیل بیان کی اور کہا کہ اس کے گہرے اثرات ہماری تہذیب، معاشرت اور زبان میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھوں نے قاضی نذرالاسلام کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری کے ذریعہ بھی اردو اور فارسی کی روایات بنگلہ ادب میں داخل ہوئی ہیں۔

آخر میں انھوں نے بتایا کہ ہمارا سرچشمۂ فیضان ہمارے عوام ہیں اور ہمارے عوام کا ایک حصہ اردو تہذیب کا علمبردار ہے اس لیے ہم کو یہ زبان اور اس کی تہذیب بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی بنگالی زبان اور اس کی تہذیب عزیز ہے۔

شری دکھنا رنجن بوس نے مغربی بنگال کے ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے اردو زبان اور اس کے ادب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ بنگلہ اور اردو اس دیس کی دو میٹھی، ترقی یافتہ اور وسیع زبانیں ہیں۔

شری دبیں داس نے اردو زبان کی وسعت اور اس کی اثر انگیزی اور اثر پذیری کو سراہتے ہوئے کہا کہ یہ ایک زندہ اور بیدار زبان ہے اور اس کی جڑیں ہندوستانی سماج میں پیوست ہیں۔ اس زبان نے ایک تاریخی فریضہ انجام دیا ہے اور ہماری رہنمائی کی ہے جس کو کوئی دیسی زبان فراموش نہیں کر سکتی۔ یہی وہ زبان ہے جو پہلی بار اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنی۔ جب بھی جامعہ عثمانیہ کا نام کسی کی زبان پر آتا ہے

تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔

انھوں نے اردو زبان کے آغاز و ارتقا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ وہ زبان ہے جو لشکروں اور بازاروں سے درباروں میں پہونچی اور ہمارے دلوں میں سما گئی جس طرح یہ زبان ہندوستان کے تمام دوسرے صوبوں میں رائج ہے ویسے ہی بنگال میں بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ زبان ہم کو عزیز ہے اس لیے کہ بنگالی زبان کے ذخیرے میں اس سے اضافہ ہوا ہے۔ یہی نہیں اس نے ہم کو نئے محاورے نئے اسلوب، نئی تشبیہات نئے استعارے، نئے محاکات دیے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ بنگالی زبان دوسری زبانوں سے بھی متاثر ہوئی ہے لیکن اردو سے اس کا تعلق بہت گہرا ہے۔

انھوں نے کہا کہ اردو حب الوطنی کی زبان ہے اس زبان کی حفاظت ہم سب کا فرض ہے۔ اس اجلاس کو ڈاکٹر راج بہادر گوڑ اور زینت ساجدہ نے بھی مخاطب کیا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر حبیب الرحمٰن نے کی۔

اردو کو تمام سہولتیں دی جا چکی ہیں

لکھنؤ۔ ریاستی وزیر جناب اوت نرائن شرما نے کل دریاباد ضلع بارہ بنکی میں ایک مشاعرہ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اردو کے لیے گزشتہ بیس برسوں سے جو وعدے اور مطالبے کیے جاتے رہے ہیں وہ سب کے سب موجودہ حکومت نے پورے کر دئے ہیں یا پورے کر رہی ہے۔ انھوں نے بہر حال سرحد بگر دوکیا کہ اردو کو دوسری سرکاری زبان بنا دینا چاہیے انھوں نے کہا اور سرکاری زبان ملک میں انتشار پیدا کر دے گا۔ اس لیے اردو کو وہ تمام سہولتیں دی جا سکتی ہیں جو دوسری زبان پانے کی مستحق ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ اس میں سے لفظ "سرکاری" نکال دیا جائے۔

انھوں نے ہندوستان کی رنگا رنگی ہی کو ملک کی تہذیب کا اصل جن قرار دیا۔ اردو کو سہولتیں دینے کے سلسلے میں انھوں نے کہا کہ اگر کوئی سہولت نہیں ملی ہے تو اس کی نشان دہی کی جائے تاکہ وہ مل سکے۔ (قومی آواز)

تامل ایک دن ملک کی رابطہ اور سرکاری زبان ہو کر رہے گی
تامل عالمی کانفرنس میں وزیر اعلیٰ مدراس کی تقریر

مدراس ۱۔ وزیر اعظم مدراس جناب سی۔ این۔ انا دورائی نے کل یہاں کہا کہ انھیں یقین ہے کہ تامل ایک دن ملک کی رابطہ زبان ہو کر رہے گی۔

دوسری عالمی تامل کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ انا دورائی نے کہا کہ تامل جو بین اقوامی حیثیت رکھتی ہے اور جس کے سیکھنے کے لیے دنیا بھر سے طلبہ آتے ہیں اور اس سے دلچسپی رکھتے ہیں اس کے اندر ملک کی رابطہ اور سرکاری زبان بننے کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک دن ہو کر رہے گا لیکن اس دن کا ہمیں صبر کے ساتھ انتظار کرنا چاہیے۔

کانفرنس کے سلسلے میں ریاستی حکومت کی جانب سے تیار کردہ کتابچہ جاری کرتے ہوئے گورنر سردار اجل سنگھ نے امید ظاہر کی کہ اس کانفرنس کی بنا پر تامل زبان میں تحقیقات کا کام اور تیز رفتاری سے شروع کر دیا جائے گا۔

زبان سے متعلق پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے سوال پر اعلیٰ سطح پر مشورہ

مدراس وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے کل رات اپنی کابینہ کے کچھ ساتھیوں کے ساتھ زبان پالیسی پر عمل کے ساتھ نفاذ کے سوال پر صلاح و مشورہ کیا حال ہی میں پارلیمنٹ اس پالیسی کو منظور کر چکی ہے اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ زبان سے متعلق قانون میں اب کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی۔ کل کے اس صلاح و مشورہ میں جو لیڈر شریک تھے ان میں مرکزی وزیر داخلہ جناب چوان وزیر تعلیم ڈاکٹر تری گن سین اور وزیر قانون جناب گووندا مینن شریک تھے۔ جن مسائل پر تبادلہ خیال ہوا ان میں غیر ہندی عوام پر سے بوجھ کو کم کرنے کا خاص طور پر آل انڈیا سروس کے مقابلوں کی روشنی میں غور کیا گیا اس سلسلہ میں تجاویز تیار کر لی گئی ہیں۔ زیادہ تر وزرا ء چیف سہ لسانی فارمولہ پر ٹھیک طور پر عمل درآمد کرنے کی اہمیت کے بارے میں ہوئی عام رائے یہ تھی کہ جن سنگھ کی زبان پالیسی میں تبدیلی اور ایس ایس پی کی صفوں میں اختلافات کے سبب ہندی ریجن میں سہ لسانی فارمولہ پر عمل درآمد آسان ہو گیا ہے۔ مرکزی وزیر تعلیم ڈاکٹر تری گن سین نے مزید روپیہ کا مطالبہ کیا اور کہا کہ تعلیمی اداروں کو سہ لسانی فارمولہ پر عمل درآمد کے سلسلہ میں مزید روپیہ چاہیے میٹنگ میں یہ رائے ظاہر کی گئی کہ فارمولہ کی کامیابی کا انحصار ریاستی حکومتوں کے رویہ پر ہے خیال ہے کہ اس سلسلہ میں ریاستوں کے وزرائے اعلیٰ سے مشورہ کیا جائے گا تاہم ابھی اس کانفرنس کی کوئی تاریخ طے نہیں ہے۔ (الجمعیۃ دہلی)

باقی صفحہ ۱۲ سے آگے

تو ذہنی شل ہوگی کہ کوا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھی بھول گیا۔ یہاں اس پھیر میں نہ پڑیے کہ کوا کون ہے اور ہنس کون چونکہ ادب کوئی جامد او رمقررہ چیز نہیں ہے کیونکہ زندگی کی طرح یہ بھی بدلتا ہے، اس لیے ادبی اظہار بھی مقررہ اور جامد نہیں ہے اس میں بھی تبدیلی ہوتی ہے اور اگر آپ ادب کی مخصوص بصیرت سے آشنا ہونا چاہتے ہیں تو ادبی اظہار کے تمام امکانات سے آشنا ہونے کے لیے اور اس سے پوری کیفیت حاصل کرنے کے لیے آپ کو اظہار کے تمام سانچوں سے ہمدردی پیدا کرنی ہے۔ اگر نہیں ہو سکتا کہ آپ کلاسیکل موسیقی کے آداب کو نہ جانتے ہوں اور رائے دیدیں کہ یہ محض شور و غل ہے، تو یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ جدید شاعری کی پیچیدہ اور جذبے اور نغمے سے کی زیادہ ترجمان زبان سے مانوس ہونے کی کوشش نہ کریں اور محض اسے خرافات کہہ کر ٹال دیں، کوئی رنگ محل اس وقت تک نہیں کھلتا جب تک آپ اس کے دروازے پر دستک نہ دیں۔ (باقی آئندہ)

آل احمد سرور

میرا صفحہ

ہمارے ادب میں صحت نظر کی خاصی کمی رہی ہے جس کی بنا پر یہ عام رہا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ایک عرصہ دراز تک ادب کو اس کی مخصوص بصیرت کی وجہ سے تخیلی تجربے کی اس کی صداقت کو ہم نے وہ اہمیت نہیں دی جو دی جانی چاہیے تھی۔ ہم نے یا تو اسے تصوف کے اسرار و رموز کے لیے استعمال کیا، یا مذہب کے احکام کی تفسیر کے لیے، یا اخلاق کے اوامر و نواہی کی وضاحت کے لیے، یا پھر سیاست کے نعروں کو مشتہر کرنے کے لیے۔ ہم نے یہاں تک غلو بحث کیا کہ اچھے اچھے شاعروں کو اس وجہ سے بڑا سمجھا کہ وہ ہمارے نزدیک فلسفی تھے۔ اقبال اور غالب کی شاعرانہ عظمت ہم نے بعض افکار کی وجہ سے جانی، ان کی شاعرانہ صلاحیت کو نہیں دیکھا۔ جب مغربی اثر سے حقیقت نگاری عام ہوئی تو ہیئت کی جزئیات نگاری کی خاطر ہم نے ان شاعروں کی تمثیلی تصویروں کو نظر انداز کر دیا جو اب بھی جادو رکھتی ہیں۔ اس طرح جذبے کی اُٹھان، داخلی کیفیات کی مستی اور افسوں و افسانہ کی اپنی حقیقت کو جھٹلا دیا گیا۔ بیسویں صدی میں جب سیاست کی لے بڑھی تو شاعر کا کام سیاسی مطالبات کو پورا کرنا ٹھہرا۔ اُسے شاعری سے زیادہ پیغمبری کرنی پڑی۔ زندگی کے حقائق کے نام پر ادب کو صحافت بنا دیا گیا۔ سماجی شعور کے نام پر اس پر رنگ چڑھا دیا گیا۔ ادب اپنی جگہ کوئی چیز نہیں رہا۔ اس کا کام سائنس، سیاست، فلسفہ، اخلاق کے نکتوں کو اپنی مبہم اور سائنسی نقطۂ نظر سے ناقص اور ناقابلِ اعتبار زبان میں بیان کرنا ہی رہ گیا۔ وہ اس عورت کی طرح جس کے کئی شوہر ہوں، باری باری اپنے سارے شوہروں کی تابعداری میں لگا رہا۔ اس کا اپنا کوئی وجود، کوئی مزاج، کوئی شخصیت مانی ہی نہیں گئی۔

حال میں ٹائمس لٹریری سپلیمنٹ میں ایک خاص ضمیمہ دو قسطوں میں نکلا ہے جس کا عنوان ہے CROSS CURRENTS۔ پہلی قسط میں انگلستان کے ادیبوں نے ادب اور سائنس، ادب اور فلسفہ، سوشیالوجی اور ناول اور شاعری کی زبان جیسے موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے۔ دوسری قسط میں یورپ کے ادیبوں نے یورپ کے ادبی سین کا انھیں عنوانوں کے تحت جائزہ لیا ہے۔ مجموعی طور پر لکھنے والوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ ناول میں سوشیالوجی سے بھی مدد مل سکتی ہے مگر سوشیالوجی جس طرح مواد جمع کر سکتی ہے اس طرح ناول نہیں کر سکتی۔ پھر بھی ناول میں چونکہ افراد کے تجربے ہوتے ہیں اس لیے ان تجربوں کی ضرورت ہمیشہ باقی رہے گی اور سوشیالوجی کی تمام ترقی کے باوجود اس کی اپنی بصیرت سے انکار نہ کیا جا سکے گا۔ اس طرح فلسفہ یا سائنس جو حقائق دیتا ہے ان کی اہمیت مسلم ہے۔ مگر ان حقائق کے باوجود ادب جس طرح زندگی سے وفاداری سکھاتا ہے، یعنی اس کے ہر رنگ اور ہر رُخ کو دیکھتا اور دکھاتا ہے جس طرح انسان کی بلندی اور پستی، اس کی ملکوتیت اور شیطنت، اس کی عقلیت اور غیر عقلیت سب کو ماننا اور سب کو دل میں جگہ دیتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے ہمیں جو مسرت اور بصیرت حاصل ہوتی ہے اس کی اپنی اور مستقل جگہ ہے۔ یعنی ادیبوں کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ زیادہ معلومات دیں، نہ ان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نئے افکار کی تلاش میں سرگرداں رہیں یا کسی فلسفی یا سائنس داں کی خوشہ چینی کرنے لگیں۔ ان کا یہ بھی کام نہیں ہے کہ وہ علوم کے ماہرین کی تفسیر و تشریح کرنے لگیں۔ علوم جو حقائق یا تصورات دیتے ہیں وہ کبھی کبھار تجربے کے سرچشموں سے کٹ بھی جاتے ہیں اور ادیب کا کام دراصل یہی ہے کہ وہ تجربے کے سرچشمے سے اپنا رشتہ کبھی ٹوٹنے نہ دے بلکہ علوم کے بخشے ہوئے حقائق اور تصورات کو نئی ترتیب دے کر اپنے حق میں ان کے انسانی اور تخیلی نتائج کو پرکھے۔ اگر اس رمز کو سمجھا جائے تو یہ نکتہ بھی سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ ادب ہی فنکار معلومات کو صحیح معنی میں حقیقی یعنی انسانوں کے لیے جاندار بناتا ہے کیونکہ وہ انسانوں کے تخیلی تجربے، ان کے جذبے، ان کی نفسیاتی دنیا اور ان کے احساس کی رنگارنگی کے ذریعہ سے ہی لوگوں کے لیے معنی خیز حقائق بنتے ہیں۔ اگر ادب کا کوئی مقصد ہے تو یہی ہے یعنی اُن فن کاروں کی مدد سے جو ایک خاص منظم احساس رکھتے ہیں، احساس کی دولت کو عام کرنا۔ ادیب کا کام دوسروں کے خیالات کو یا عام خیالات کو دہرانا نہیں ہے، اس کا کام محض تماشائی بننا بھی نہیں ہے، وہ ذاتی طور پر زندگی سے الجھتا ہے۔ اس میں شخصی طور پر دلچسپی لیتا ہے۔ ایک فن کار یا ادیب کو حقیقت کا ایک شخصی اور ذاتی روپ بناتا ہے ہاں یہ ضروری ہے کہ یہ شخصی اور ذاتی روپ خارجی حقیقت کی اصطلاحوں میں بیان کیا جا سکے۔ ادب میں جان ذاتی اور شخصی نظر سے آتی ہے۔ ادب کی وفاداری اسی ذاتی اور شخصی نظر سے ہونی چاہیے۔ اس کے بعد اس کی وفاداری اپنے میڈیم یعنی الفاظ سے ہونی چاہیے کیونکہ وہ اپنے میڈیم کو اگر جانتا یا برتتا نہیں تو وہ یا تو رسمی الفاظ کا غلام ہو جائے گا یا علوم کی دنیا میں دست درازی کرنے لگے گا۔

اردو ادب میں آزادی کے بعد ہی دراصل ادب کی اپنی اہمیت کا احساس پیدا ہوا ہے اور اس کے مخصوص دائرہ اثر کی اہمیت کا کچھ اعتراف شروع ہوا ہے، مگر چونکہ ہم مجموعی طور پر ابھی تک قدامت پرست یا روایت پرست ہیں اس لیے اس نئے احساس یا اعتراف کو بہت سے لوگ شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر ہم اس بات کو تسلیم کر لیں کہ ادیب کی وفاداری سب سے پہلے ادب سے ہونی چاہیے تو پھر یہ بات بھی تسلیم کر لی جائے گی کہ اس میں سیاست، اخلاق، فلسفہ، سائنس، سب کی جگہ ہے، مگر شرط یہ ہے کہ یہ ادب بن کر آئیں، اپنے الگ وجود پر ادب کے ایوان میں اصرار نہ کریں۔ اس کے ساتھ پھر یہ بات بھی آسانی سے سمجھ میں آ جائے گی کہ اگر ادب نے سائنس یا سیاست کی جگہ لینی چاہی

(بقیہ صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ پرنٹر صغیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا اور پبلشر نذیر حسن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ سے شائع کیا